مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

از

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی رحمہ اللہ

ماہنامہ دار العلوم دیوبند
دسمبر 1953ء

صلے اللہ علیہ وسلم

مسئلہ حیات النبی

دیوبندی مکتبِ خیال کی روشنی میں

(مولٰنا اخلاق حسین قاسمی الدہلوی)

اِس عقیدہ پر تو ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم "حیات" ہیں۔ لیکن وہ حیات کیسی ہے۔؟ برزخی (رُوحانی) یا دنیوی (جسمانی) — اس کے جواب میں علماء کے دو مشہور مسلک سامنے آتے ہیں:۔

ایک طبقہ جسمانی زندگی کا قائل ہے اور کچھ حضرات صرف رُوحانی اور برزخی زندگی کے۔

پہلا طبقہ کہتا ہے:۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں اسی طرح حیات ہیں جس طرح آپ جسمِ مبارک کے ساتھ دُنیا میں حیات، تھے۔

دوسرا طبقہ کہتا ہے:۔

آپ کی حیات برزخی ہے، جیسی کہ شہداء فی سبیل اللہ کی، لیکن نہ بالکل ان جیسی، بلکہ اُن سے بہت ممتاز اور افضل۔

پہلے طبقہ کی ترجمانی حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں اس طرح کی ہے:۔

جسمانی زندگی کے دلائل:۔

پہلی دلیل انبیاء علیہم السلام کے اجسام قبروں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ زمین کے لئے ممنوع ہے کہ وہ انھیں گلائے یا سڑائے۔

ان اللہ حرّم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء[۱] — "اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو کھائے"

قبروں میں جسم اسی لئے محفوظ ہیں کہ اُن کے ساتھ رُوحوں کا تعلق قائم ہے، اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے۔

حضرت قتادہ (مشہور تابعی) نے جسموں کی حفاظت کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے:۔

بلغنی ان الارض لا تسلط علی جسد الذی لم یعمل خطیئۃً[۲] — "مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ زمین اس جسم پر مسلط نہیں کی جاتی"

حضرت قتادہ نے حیاتِ انبیاء کی اصل وجہ کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی جو جسم گناہوں کی آلودگی سے پاک ہیں وہ جسمانی عالم سے جُدا ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور زمین اُن کا ایک رونگٹا بھی خراب نہیں کر سکتی۔

یہ مسلّم ہے کہ خطاؤں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کو حاصل نہیں، اس لئے اُن ہی کے اجسام قبروں میں محفوظ ہیں

اب رہا یہ سوال کہ اگر قبروں میں جسموں کی حفاظت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جسمانی زندگی کے ساتھ زندہ ہیں تو پھر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اُن لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جن کے جسم قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ مثلاً خود سرورِ عالم نے قرآن کے حافظوں کے متعلق فرمایا:۔

اذا مات حامل القرآن اوحی اللہ تعالیٰ الی الارض — "جب حامل قرآن مرتا ہے تو خدا تعالیٰ زمین کو حکم دیتا ہے کہ وہ اُس کا گوشت

[۱] بوادر النوادر ص ۵۱۹ بحوالہ ابوداؤد ابن ماجہ حاکم ۱۲۔

[۲] تفسیر مظہری۔ بحوالہ طبرانی عن جابرؓ

ان لاتاکل لحمہٗ فتقول الارض یارب کیف اکل لحمہٗ وکلامك فی جوفہٖ[1] (تفسیر مظہری)

نہ کھائے تو وہ کہتی ہے کہ اے پروردگار میں اُس کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں جب تیرا کلام اس کے سینے میں محفوظ ہے۔"

اِسی طرح اُحد کے شہیدوں کے متعلق یہ ثابت ہے کہ اُن کی لاشیں اپنے مدفنوں میں محفوظ نکلیں۔ جب واقعہ اُحد کے چالیس سال بعد حضرت معاویہ کے عہد میں میدانِ اُحد میں نہر نکالنے کے لئے زمین کھودی گئی تو حضرت عمرو ابن جموح اور حضرت عبداللہ ابن جبیر انصاری کی لاشیں بالکل تروتازہ پائی گئیں اور حضرت حمزہ کی لاش پر کدال لگنے سے اُن کے پیر میں سے خون نکلا[2]۔

یہ واقعات بھی صحیح ہیں اور سرورِ عالم کا ارشاد بھی درست ہے لیکن یہ محض جزوی فضیلتیں ہیں جو اظہارِ کرامت کے طور پر خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو عطا فرما دیتا ہے، یہ کوئی عام کلیہ نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حافظ قرآن کا جسم قبر میں لازمی طور پر محفوظ رہتا ہے۔ یا بلا استثناء ہر شہید کے جسم کو قبر میں وہ خاص حفاظت میسر ہوتی ہے جس کا اعلان انبیاءِ کرام کے متعلق کیا گیا ہے۔

جزوی فضیلت کے خاص خاص واقعات میں اور عام کلیہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم پاک قبر میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا ــــــــ جس یقین کے ساتھ ہم اس حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں کسی نیک سے نیک انسان کے بارے میں بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

سرورِ عالم کے جسم اطہر کا قبر میں محفوظ ہونا ایک تاریخی حقیقت کے طور پر بھی ثابت ہو چکا ہے، اُس واقعہ سے جو پانچسو ستاون ہجری میں سلطان نورالدین زنگی کے ساتھ پیش آیا، اور جسے مدینہ منورہ کے تمام مؤرخین جمال مطری، علامہ مجدالدین فیروز آبادی وغیرہ نے اپنی تاریخوں میں بیان کیا ہے[3]۔

۱؎ و ۲؎ تفسیر مظہری ۱۲ ـ +

۳؎ مدارج النبوۃ صفحہ ۵۸۷ ج ۲ ـ +

دوسری دلیل[2]

عام طور پر موت کے بعد انسان کے جسم میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے، چہرے پر وحشت برسنے لگتی ہے ہاتھ، پیر اکڑ جاتے ہیں، ناک کا بانسا بھر جاتا ہے۔ لیکن سرورِ عالم کا جسدِ اطہر اس قسم کے تمام تغیرات سے محفوظ رہا، وصال کے بعد کسی نے آپ کے روئے انور میں کوئی ادنیٰ فرق بھی محسوس نہیں کیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں:۔

غسل دیتے وقت میں نے حضورؐ کے جسم میں وہ علامات تلاش کیں جو مرنے کے بعد انسان میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ لیکن باوجود تلاش کے میں نے کوئی علامت نہیں پائی۔

اسی پر حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

بابی انت وامی ما اطیبك حیاً ومیتاً[4]

"میرے ماں باپ آپ پر قربان! کس قدر پاکیزہ ہے آپ زندگی میں بھی اور موت میں بھی"

ہر دور میں علماءِ اُمت نے اس تاریخی حقیقت کی پوری قوت سے حفاظت کی۔ اگر کسی نے اس کے خلاف کچھ کہا تو اُس کے ایمان میں کلام ہونے لگا۔

وکیع ابن جراح نے اسماعیل ابن ابی خالد سے یہ کہا کہ وفات کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیٹ پھول گیا تھا، انگلی مڑ گئی تھی، اور ناخن سبز ہو گئے تھے، کیوں کہ آپ پیر کے دن کے وفات پائے ہوئے بدھ کی رات کو دفن کئے گئے تھے ــــــــ

اور اس کی حکمت یہ بیان کی ــــــــ

اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کی جماعت میں سے جن لوگوں نے آپ کی وفات کا انکار کیا تھا وہ ان علامات کو دیکھ کر آپ کی وفات کا یقین کر لے۔

وکیع کی یہ باتیں جب مکے کے والی حاکم عثمان کے پاس پہنچائی گئیں تو حاکم نے وکیع کو حرم سے باہر پھانسی دینے کا حکم دے دیا۔ سفیان ابن ابن عیینہ کو والی مکہ کا یہ فیصلہ معلوم ہوا، انہوں نے آکر وکیع کے لئے سفارش کی، والی مکہ نے ان کی سفارش قبول کر لی اور وکیع مکہ سے مدینہ طیبہ چلے گئے[5]۔

سرورِ عالم کے جسم میں تغیر نمودار ہونے کی روایات کو ابن سعد نے

۴؎ ابن ماجہ کتاب الجنائز ۱۲ - ۵؎ نسیم الریاض شرح شفا صفحہ ۳۹۰ +

طبقات میں نقل کیا ہے، اس کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے :-

" ابن سعد عرصہ سے مفقود تھی، اب اُسے یورپ والوں نے چھپوایا ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اصل نسخہ کے مطابق ہے یا اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے، اس میں امہات المومنین اور حضور کی وفات سے متعلق بعض ایسی روایات موجود ہیں جن کا دوسری اسلامی تصنیفات میں باوجود تلاش کے کہیں پتہ نہ چلا۔ پھر ابن سعد خود بھی کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی تمام روایات قابل قبول ہوں، لہذا اس کی وہی باتیں قابل اعتبار ہو سکتی ہیں جو تفسیر و حدیث کی دوسری متداول کتابوں میں موجود ہیں، ملا علی قاری نے موضوعات کبیر میں جو قاعدہ لکھا ہے اس کا حاصل یہی ہے۔"

تیسری دلیل — چند احادیث

(۱) پہلی حدیث :-

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون[۱] "انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں"

(۲) دوسری حدیث :-

خدا تعالیٰ نے کچھ فرشتے اس کام کے لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ زمین پر گشت کریں اور میری اُمت کا درود و سلام مجھ تک پہنچائیں[۲]

(۳) تیسری حدیث :-

امام عبدالحق جو کبار محدثین میں سے ہیں انہوں نے احکام صغریٰ میں حضرت ابن عباس کی ایک صحیح روایت نقل کی ہے، حضور نے فرمایا :-

" جو شخص اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر پر جاتا ہے جس مسلمان کو وہ جانتا تھا، اور جا کر سلام کرتا ہے تو وہ صاحب قبر اسے جواب دیتا ہے۔"

پس جب عام مسلمانوں کے بارے میں یہ ثابت ہے تو حضورؐ تو ہر حال میں افضل و اکمل ہیں[۳]

(۴) چوتھی حدیث :-

حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں، حضور نے ارشاد فرمایا :-

" اگر فرشتے تمہارے اچھے اعمال مجھ تک پہنچاتے ہیں تو میں خوش ہوتا ہوں اور اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور اگر بُری اعمال پہنچاتے ہیں تو اُن کے لئے دُعائے مغفرت کرتا ہوں۔"

اِن احادیث کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں :-

" اِن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرور عالم کو اپنی قبر شریف میں حیات حسّی حاصل ہے، نہ صرف حیات معنوی جیسی کہ شہیدوں کو حاصل ہوتی ہے۔"

دوسرے طبقہ میں سے علامہ علاؤالدین قونیوی جو علماء شافعیہ میں ایک بڑے صاحب تصوّف بزرگ ہیں، حضور کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" ہمارا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کے پاس جنت المأویٰ میں حیات متعارف سے بہتر حیات کے ساتھ قیام گیر ہیں، اور یہ حالت قبر میں مقیم رہنے کی حالت سے کہیں زیادہ افضل و بہتر ہے۔ اگرچہ حضور نے فرمایا ہے کہ " مومن کی قبر حدِ نگاہ تک وسیع ہوتی ہے " ——— پھر انبیاء علیہم السلام کی قبروں کا کیا کہنا ——— لیکن اِس کے باوجود آپ کا جنت المأویٰ میں ہونا سب سے افضل و اعلیٰ حالت ہے۔ چنانچہ خود حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پاس تم سے بہتر حالت میں ہونگا کیوں کہ مجھے میرا رب تین روز کے بعد قبر میں نہیں چھوڑے گا۔"

شاہ صاحب علامہ کے " عقیدہ " پر لکھتے ہیں :-

" قبر شریف کے قیام " اور " پروردگار کے پاس قیام " ان دونوں باتوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، کیونکہ قبر کی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے حضور کو اتنی قدرت عطا فرمائی ہے کہ آپ جہاں چاہیں جائیں ——— بعینہٖ یا بمثالہ ——— لیکن ہر حال میں آپ کو اپنی قبر شریف کے ساتھ ایک خصوصی نسبت قائم رہتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک مومن کی قبر کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی قبر جنت کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ہے تو پھر اس لحاظ سے نبی کی قبر تو جنت کا عمدہ ترین ٹکڑا ہونا چاہیئے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ نے آپ کی قبر مبارک اور زمین و آسمان اور جنت و عرش کے درمیان سے تمام پردے اُٹھا دئے

[۱] بحوالہ مسند ابو یعلیٰ عن انس [۲] نسائی عن ابن مسعود [۳] مدارج النبوۃ ۱۲۰

ہیں اور آپ کو اتنا تصرّف اور نفوذ حاصل ہوگیا ہے کہ آپ بلا انتقال مکانی جہاں چاہیں تشریف لے جائیں۔

یہ بات اس عالم کے لئے ممکن ہے، کیونکہ احوال دُنیا محدود ہیں اور احوال برزخ و آخرت غیر محدود ہیں۔

قبر شریف کے متعلق علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں:۔

"وہ کونسی جنّت ہے جو حضور کی قبر مُبارک سے افضل ہوگی، آپ کی قبر مُبارک جنّت ہی سے نہیں بلکہ تمام مقاموں سے اعلیٰ وارفع ہے اگر یوں کہا جائے کہ اس قطعہ مُبارکہ کا جو حصّہ حضور کے جسم اقدس سے ملحق ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو اس میں بھی کسی مومن کو توقف نہیں ہوسکتا۔[1]

ان دونوں طبقوں کی تشریحات آپ کے سامنے پیش کردی گئیں، اب اس مسئلہ پر دیوبندی مکتبِ خیال کی وہ تشریح ملاحظہ کیجئے جو متقدمین کے سارے اختلافات کو ختم کرکے تمام صورتوں میں بہترین تطبیق پیدا کرتی ہے ——— نہ نصوص میں کوئی اشکال باقی رہتا ہے اور نہ عقلاً کوئی اُلجھاؤ سامنے آتا ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اپنے ایک مکتوب میں زیارت قبر نبویؐ کے متعلق حافظ ابن تیمیہ کے مسلک کو مرجوح قرار دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"مدینہ منورہ کی حاضری محض جناب سرورِ کائنات کی زیارت اور آپ کے توسل کی غرض سے ہونی چاہیئے۔

آپ کی حیات نہ صرف رُوحانی ہے جو کہ عام مومنین اور شہدا کو حاصل ہے بلکہ جسمانی بھی ہے اور از قبیل حیاتِ دنیوی بلکہ بہت سے وجوہ سے اس سے قوی تر ہے، آپ سے توسل نہ صرف وجود ظاہری کے زمانہ میں کیا جاتا تھا، بلکہ اس برزخی وجود میں بھی کیا جانا چاہیئے۔ محبوبِ حقیقی تک وصال اور اُس کی رضا صرف آپ ہی کے ذریعہ اور وسیلہ سے ہوسکتی ہے۔"[2]

حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند جو ہمارے اکابر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے علوم و معارف کے بہترین شارح ہیں، اس مسئلہ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضور کی حیات برزخی ہے مگر اس قدر قوی ہے کہ بلحاظ آثار دنیوی بھی ہے یعنی دُنیا میں جب تک حضور تشریف رکھتے تھے حیات ناسوتی تھی مگر اسی آن وہ برزخی بھی تھی اور برزخ ایک درمیانی عالم ہے وہ حیات اُخروی بھی تھی۔ چنانچہ اسی حیات ناسوتی اور اسی جسم اطہر کے ساتھ سماوات اور ارضین طے کرنا عرش تک جا پہونچنا، مسجدِ اقصےٰ میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کرنا، ظاہر ہے کہ ترکِ جسد کے ساتھ نہ تھا، پس حیات تو اسی جسدانی عالم کی تھی لیکن جسد اطہر خود اتنا لطیف تھا کہ وہ اسی آن عالم برزخ بلکہ عالم غیب کے معاملات اور مشاہدات کی طاقت بھی لئے ہوئے تھا، پس اگر وہی جسدِ اطہر جو دُنیا میں ہمرنگ رُوح تھا بعد وفات اگر عالم برزخ میں پہنچکر بحق دُنیا، اسی طرح زندہ ہے جیسے معراج کے وقت سارے غیبی عالموں میں پہنچکر اپنی جسدانی ہستی کو بحق دُنیا سنبھالے ہوئے رہا اور دنیوی حقوق، اُس کے بدستور قائم رہے تو اس میں تعجب یوں نہیں کہ یہ معاملہ تو اس جسدِ پاک کو بوقتِ معراج پہلے بھی پیش آچکا تھا، فرق اتنا ہوا، کہ شبِ معراج میں جسم اطہر کے ساتھ رُوح پر فتوح کا تعلق حسّی طور پر اسطرح قائم تھا کہ اگر ہم ہوتے تو ہم بھی احساس کرسکتے تھے اور بعد وفات اِس طرح حسّی طور پر قائم نہیں رہا کہ ہمیں بھی نظر آئے، سو یہ قصور ہمارا ہوا، نہ کہ تعلق رُوح و جسد کی نوعیت کا، یہی وجہ ہے کہ بعد وفات حضورؐ کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی جنازہ میں کلام فرمایا، کہ:۔

"بیرا دیس وما بیرا دیس، سوف تعلمون" اور قبر میں کلام فرمایا جسکو بعض صحابہ نے سُنا، یہ تو وفات کے بعد فوری بات تھی کہ رُوح نے جسم کو کلیۃً نہیں چھوڑا۔ لیکن بعد میں تا حشر بھی رُوح کا وہی تعلق بدن سے قائم رہے گا، جیسا کہ بنص حدیث اجساد انبیاء کا مٹی پر حرام ہونا ثابت ہے۔ اگر اُن ابدان میں کوئی رُوح نہیں ہے تو انھیں گل جانا چاہیے۔ پھر حیات کا یہ اثر عالم برزخ میں ہے، عالم دُنیا میں یہ ہے کہ اُن کے اموال میں میراث جاری نہیں ہوتی، اُن کی ازواج میں بیوگی نہیں آتی، اُن کے نکاح حرام ہوتے ہیں۔ نہ صرف عظمتِ انبیاء کی وجہ سے بلکہ حقیقۃً حیات کی وجہ سے کہ وہ بیوہ ہی نہیں ہیں۔

[1] مدارج النبوۃ ص۲۲۷ ج ۲، [2] مکتوبات شیخ الاسلام ص۱۳۱ ٭

پس انبیاء کی یہ برزخی حیات جسمانی از قبیل حیات دنیوی بھی ہے کہ اجسام میں حس وحرکت بھی ہے، قبروں میں عبادت بھی ہے، کلام بھی ہے، امت کی طرف توجہ بھی ہے، تصرف بھی ہے، بقاء اجسام بھی ہے، اور حیاتِ اجسام بھی ہے، پھر یہی حیات از قبیل حیات برزخی بھی ہے کہ نگاہوں سے اوجھل ہیں، اُن کی آواز ان کانوں میں نہیں آتی، اور کلام ان حسی کانوں میں نہیں پڑتا۔ نیز توجہ الی الامت اور رُخ کا پھیرنا، ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ سو اس میں ہماری کمزوری، اور ضعفِ قویٰ کو دخل ہے نہ کہ ان آثار کے موجود نہ ہونے کا، یا قابلِ وجود ہونے کا۔

بالفاظ مختصر دونوں حیاتیں اس طرح جمع ہیں کہ حیات برزخی اصل ہے اور حیات دنیوی اس کے تابع، یعنی وہ عیناً موجود ہے یہ آثاراً موجود ہے، اس طرح دونوں حیاتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ مگر نہ استعارۃً بلکہ حقیقتاً۔

پہلی حیات یعنی دنیوی زندگی میں عین نبوی اس جہاں میں تھا اور تمثل اس جہاں میں، (اور عکس یا تمثال عین شئی ہوتا ہے) اور اس دوسری حیات میں عین نبوی اس جہاں میں ہے اور تمثل اس جہان میں جیسے وہاں کا تمثل ہر کس و ناکس نہیں دیکھ سکتا، ایسے ہی اب یہاں کا تمثل ہر کس و ناکس نہیں دیکھ سکتا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ عکس شے اور شئی میں عینیت کا علاقہ ہوتا ہے، اگر تباین کا ہو تو مثال یا صورت دیکھ کر کبھی بھی عین کا تعارف نہ ہوا کرے، اس لئے جس جہاں میں جب بھی وجود ہو دوسرا وجود اس کا عین ہے اس لئے حضور اس برزخی جہاں میں رہ کر اگر اس جہاں میں متجلی اور منعکس ہیں تو بعینہٖ ہیں نہ کہ کسی استعارہ یا تشبیہ کے طور پر۔ "واللہ اعلم"

ایک اشکال اور اس کا حل

مسئلہ حیات النبی ﷺ پر ایک مشہور اشکال ہے جو حسب ذیل حدیث کی بناء پر پیدا ہو گیا ہے، ضروری ہے کہ بحث کی تکمیل کے لئے اسکی بھی وضاحت کر دی جائے۔

حدیث یہ ہے:۔

ما من احد یسلم علیّ الا رد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام۔

"جب مجھ پر کوئی سلام بھیجتا ہے، تو خدا تعالیٰ میری رُوح کو میری طرف لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں"

اس حدیث نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ کیا حضور کی رُوح آپ کے جسد پاک سے جدا رہتی ہے اور اس وجہ سے سلام کا جواب دینے کیلئے آپ کے تن پاک میں اُس کا لوٹانا ضروری ہوتا ہے، پھر اگر یہ بات ہے تو حیات جسمانی کے کیا معنی؟ ——

اس اشکال کا جواب ایک تو حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے دیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"سرورِ عالم کی رُوح ہمیشہ مشاہدہ الٰہی میں مستغرق رہتی ہے، جب کوئی مسلمان آپ پر درود بھیجتا ہے تو آپ کی رُوح کو افاقہ دے کر اس عالم کی طرف توجہ کرنے کی فرصت دیدی جاتی ہے تاکہ آپ اُس کا جواب دے سکیں"

حضرت شاہ صاحب کے جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور کو مشاہدہ میں استغراق کا موقعہ ہی نہیں ملتا، کیوں کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جس میں آپ پر درود و سلام نہ بھیجا جاتا ہو تو پھر آپ کی توجہ کا اس عالم کی طرف ہر آن لگا رہنا ضروری ہوا۔

اس اشکال کی وضاحت حضرت شیخ الاسلام مولٰنا سید حسین احمد صاحب مدنی نے اپنے ایک مکتوب میں اس طرح فرمائی ہے:۔

"اگر لفظ "الی روحی" فرمایا گیا ہوتا تو آپ کا شبہ وارد ہو سکتا ہے، الی اور علی کے فرق سے آپ نے ذہول فرمایا۔ علی استعلاء کے لئے آتا ہے اور الی نہایت طرف کے لئے، اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وسلام سے پہلے رُوح کا استعلاء نہ تھا، نہ یہ کہ وہ جسم اطہر سے بالکل خارج ہو گئی تھی، اور اب اس کو جسم اطہر کی طرف لوٹایا گیا ہے۔

چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مدارج قرب و معرفت میں ہر وقت ترقی پذیر ہیں اس لئے "توجہ الی اللہ" کا انہماک اور استغراق دوسری

جانب کی توجہ کو کمزور کر دیتا ہے۔ چنانچہ اہلِ استغراق کی حالتیں روزانہ مشاہدہ ہوتی ہیں، مگر جب رسول اللہ صلعم کو رحمۃ اللعالمین بنایا گیا ہے اِس لئے بارگاہ الوہیت سے درود بھیجنے والے پر رحمتیں نازل فرمانے کے لئے متعدد مزایا میں ایک مزیت یہ بھی عطا فرمائی گئی، کہ خود سرورِ کائنات کو اس استغراق سے منقطع کر کے درود بھیجنے والے کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے اور آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر اُس کے لئے دُعا فرماتے ہیں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام صـ ۲۴۳)

جو اشکال حضرت شاہ صاحب کے جواب پر وارد ہوتا ہے وہی اشکال اس جواب پر بھی وارد ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں اِس گتھی کو سُلجھایا ہے، لکھتے ہیں:-

"اس کی گرہ یوں کھُلتی ہو کہ وہاں آسمان پر جو موسیٰ علیہ السلام کو آپ نے دیکھا تو وہ انکی رُوح کا مقام و مستقر تھا اور قبر اُن کے جسم کا، جہاں وہ قیامت میں رُوحوں کے لوٹانے کے وقت تک رہے گا، اِسی طرح آپ نے اُن کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا، جس طرح وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بلند تر مقام یعنی رفیق اعلیٰ میں بھی قرار گیر ہیں اور جسم مُبارک قبر شریف میں بھی موجود ہے، جب درود و سلام بھیجنے والا آپ پر سلام بھیجتا ہے تو خدا تعالےٰ آپ کی رُوح کو واپس کرتا ہے تاآنکہ آپ جواب دیتے ہیں، حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ سے آپ علیحدہ نہیں ہوئے، جو موٹی طبیعت کا آدمی اس مطلب کو نہ سمجھ سکے اُسکو چاہئے کہ آفتاب کی کہ اس کی دوری اور بلندی کے باوجود اس کا تعلق زمین سے قائم ہے اور اُس کے اندر وہ اثر ڈالتا ہے، اور نباتات اور حیوانات کی زندگی میں اس کو دخل ہے۔ پھر رُوح کا مرتبہ تو اِس سے بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ رُوح کا معاملہ اور ہے اور جسم کا معاملہ اور ہے، دیکھو! آگ اپنی جگہ رہتی ہے اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے، رُوح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے اِس لئے کہ رُوح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔"

فقل للعیون الرمد ایاک ان تری سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

"گدلی آنکھوں سے کہہ دو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ انھیں راتوں کی تاریکی ڈھانپ چکی ہے"

(زاد المعاد ۱/۲۰ مصر)

اب وہ جواب ملاحظہ کیجئے جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں دیا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُمت کی طرف توجہ فرمانے سے حضور کے استغراق میں قطعاً فرق نہیں پڑتا، فرماتے ہیں:-

"روح پر فتوح نبوی صلعم جب منبع اور اصل ارواح باقیہ خصوصاً ارواح مومنین امت ٹھیری تو جونسا اُمتی آپ پر سلام عرض کرے گا اُس کی طرف کا شعبہ لوٹے گا، ارتداد جملہ شعب لازم نہیں، اور ظاہر ہے کہ اس شعبہ کا ارتداد باعث اطلاع سلام تو ہوگا پر موجب زوال استغراق مطلق نہ ہوگا، آخر شعب غیر متناہی اور ہیں۔" (آبِ حیات صـ ۲۳۳)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اس عبارت کی تشریح میرے ایک استفسار پر اپنے مکتوب گرامی میں اس طرح فرماتے ہیں:-

"آبِ حیات وہ کتاب ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے یہ کتاب اُستاد رحمۃ اللہ علیہ سے درساً درساً پڑھی ہے، تب مصنف کے مدارک پر مطلع ہوا ہوں، میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس واقعہ کا حوالہ دیکر عرض کیا تھا کہ مجھے یہ کتاب آپ پڑھا دیں، تو انہوں نے بایں ذہن وذکاء فرمایا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں، تو ایسی کتاب ہم جیسے نالائقوں کے بس کی بات کیا ہو سکتی ہے اور پھر اس کا بھی ایک ٹکڑا جس کا سیاق وسباق بھی سامنے نہ ہو، اور سامنے کرنے کی فرصت بھی نہ ہو تو جناب خیال فرمائیں کہ ہم جیسوں سے اس میں کیا بن پڑے گا، تاہم مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ ـــ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ایک مستقل نظریہ ہے اور عین مطابق کتاب وسنت ہے کہ اولاً وحقیقتاً مخلوقات میں مومن آپ ہیں، اور آپ کے پرتوؤں سے دوسرے لوگ اس طرح مومن ہیں جیسے آفتاب بالاصل منور ہے اور در و دیوار اس کے دھوپ پڑ جانے سے منور کہلانے لگتے ہیں۔

پس حقیقتاً در و دیوار منور نہیں ہوتے بلکہ دھوپ اور شعاع منور ہوتے ہیں ان کے لگ جانے سے یہ بھی منور کہلانے لگتے ہیں۔ پس اصل میں مومن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے نامزد ہو کر جس کا حاصل انقیاد کلی ہے امتی کو بھی مومن کہا جانے لگتا ہے۔ پس جس طرح

دُھوپوں کے ٹکڑوں کی اس کے سوا کوئی تعریف اور حد نام کچھ نہیں کہ وہ آفتاب کا ایک اثر ہے۔ اِسی طرح مومن کی اس کے سوا کوئی تعریف نہیں کہ وہ پیرو نبوی ہے اور اسکی رُوح وہاں سے کوئی حصّہ پائے ہوئے ہے۔

اِس کا قدرتی اثر یہ ہے کہ دُھوپ کو آفتاب کا نُورانی سایہ کہا جائے جدھر اس کا رُخ ہوگا اُدھر ہی دُھوپ کی نقل و حرکت ہوگی، وہ ٹھہر جائے گا یہ بھی ٹھہر جائے گی، وہ لوٹ جائے گا، یہ بھی لوٹ جائے گی۔ اِسی طرح مومن بحیثیت مومن حضور کا ایمانی سایہ ہے، جدھر کو آپکے عقیدے و عمل کا رُخ ہوگا اُدھر ہی کو اس کا بھی رخ ہوگا۔ پس مومن کی ایمانی نقل و حرکت تابع ہے حضور کی ایمانی نقل و حرکت، اسی کو ادھر سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر دُھوپ حرکت کر رہی ہے تو یہ دلیل ہوگی کہ آفتاب ضرور حرکت میں ہے، گویا پہلے وہ حرکت میں آیا تب یہ حرکت میں آئی۔ گویا آفتاب متوجہ ہوا تو دھوپ میں نقل و حرکت پیدا ہوگئی۔ لیکن اس خاص قطعہ دھوپ کی طرف آفتاب کے توجہ کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب وہ دوسری دھوپوں کی طرف متوجہ نہیں رہا ہمہ تن اسی دھوپ کا ہوگیا، بلکہ اسے بھی حرکت میں لا رہا ہے اور دوسرے قطعہ ہائے دھوپ بھی اپنی اپنی جگہ اپنے ظرف میں اس کی حرکت سے متحرک ہیں۔ پس بظاہر تو دُھوپ آفتاب کی طرف متوجہ ہے اور بحقیقت آفتاب دُھوپ کی طرف متوجہ ہے۔ اِسی طرح بظاہر تو اُمتی درود و سلام پڑھ کر حضور کی طرف متوجہ ہے مگر بحقیقت پہلی توجہ حضور کی ہے جس سے اس کے قلب کا رُخ حضور کی طرف ہوگیا ہے اور جیسے آفتاب ایک قطعہ کی طرف توجہ کرکے ہمہ تن اس ایک قطعہ میں مستغرق نہیں ہو جاتا ایسے ہی حضور بھی کسی ایک دو، دس بیس اُمتیوں کی طرف یہ توجہ خاص فرما کر دوسرے اُمتیوں سے بے رُخ نہیں ہوتے، اور استغراق کلی فرد واحد کی طرف نہیں ہوتا جسکو دوسرے افراد سے زوالِ استغراق سے تعبیر کیا جائے، کیونکہ شعب بے انتہا ہیں جن کی طرف توجہ ہے۔ اسی سے یہ واضح ہوا کہ اگر استغراق ہو سکتا ہے تو پوری اُمت کی طرف ہو سکتا ہے نہ کہ ابعاض کی طرف، لہذا استغراق بھی ثابت مگر لجمیع الامۃ اور عدم استغراق بھی مگر لابعاض الامت۔

پھر یہ بھی یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ آفتاب اگر ساری دُھوپوں کی طرف متوجہ ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے نفس اور مالک النور کی طرف متوجہ نہیں، اگر اس کا رُخ خود اس کی ہی اصل کی طرف نہ ہو تو یہ نُور ہی اس میں کہاں سے آئے؟ اس لئے وہ اپنے اصل منبع النور یعنی ذات خداوندی کی طرف بلا شبہ رُخ کئے ہوئے ہے، اس منبع النور کی طرف سے اس کا رُخ دھوپوں کی طرف کل کی طرف اور بعض کی طرف کردیا ہے کہ انکو یا وہ اوپر سے نور لیتا ہے اور نیچے کو دیتا ہے۔ ٹھیک اِسی طرح حضور پُر نور اگر تمام اُمت یا ابعاض امت کی طرف متوجہ ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ اپنے نفس کریمہ اور اپنے اصل حقیقی یعنی رب العزت کی طرف متوجہ ہیں۔ نہیں بلکہ اُدھر متوجہ ہو کر نُور لیتے ہیں، حاصل شُدہ نور کا ذخیرہ اپنے نفس کریمہ میں جمع فرماتے ہیں اور پھر اس مخزنِ نُور سے توجہ اُمت کی طرف فرماتے ہیں تو اُمتی بھی بطور ردِ عمل حضور کی طرف متوجہ ہو کر جس کی صورت صلوٰۃ و سلام ہے نُور حاصل کرتے ہیں۔ اِسی بجانب الشرح کا اپنے نفس کریمہ کی طرف پھرنا۔ ردّ اللہ علی روحی سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور پھر نفس کریمہ کو اُمتی کی طرف متوجہ کرنے کو حتی اسلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پس ردّ روح کا مطلب نفخ روح نہیں بلکہ اقبال و توجہ ہے، اسلئے یہ حدیث درحقیقت شرح ہے اس نظریہ کی جو آبِ حیات کی عبارت میں مرقوم ہے، اور اس عبارتِ قاسم العلوم کی شرح اپنے فکر ناقص سے وہ ہے جو عرض کی گئی۔" واللہ اعلم +

حاصل یہ ہوا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن مشاہدہ جمالِ الٰہی میں بھی مستغرق رہتے ہیں اور اُمت کی طرف بھی آپکی توجہ ہر لحظہ مبذول رہتی ہے، نہ یہ "استغراق توجہ" میں مانع ہوتا ہے نہ "توجہ استغراق" میں، یہی وجہ ہے کہ جب امت کا ایک عارف کامل حالت کشف میں اپنے محبوب کے جمالِ جہاں آرا کے دیدار سے مشرف ہوا تو اس نے سرورِ عالم کو اس حال میں پایا:۔

"ورأیتہ مستقراً علی حالۃ واحدۃ متوجھا الی الخلق لا ینسا لباس العظمۃ فاذا توجہ الیہ انسان بجھد ھمتہ ولا ارید الانسان العالی الھمۃ فقط بل کل ذی کبد یشتاق الی شیئ و یتوجہ الیہ بقصدہ وشوق فانہ یتدلی الیہ۔ رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم ینشرح انشراحاً عظیما للمصلی علیہ وحدہ"

"میں نے سرورِ عالم کو اس حال میں دیکھا کہ آپ بندگانِ الٰہی کی طرف متوجہ تھے، بڑی توجہ کیساتھ عظمت و بڑائی کا لباس آپکے زیب تن تھا۔ جب کبھی خدا کا بندہ ذوق و شوق کے ساتھ آپکی طرف متوجہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ سرورِ عالم اس سے قریب ہوگئے، اور میں نے دیکھا کہ جس شخص نے حضور پر درود و سلام بھیجا اور آپکی تعریف کی تو آپ اُس سے بہت زیادہ خوش ہوئے"

ع یہ شخص زمان کا جو عارفوں کے امام اور محدثوں کے سردار تھے یعنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی جسے انہوں نے اپنی مشہور کتاب "فیوض الحرمین" میں ذکر کیا ہے